ایمان اور رضا[1]

— عبدالحمید صدیقی —

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ[2]

عالمِ مادّی میں اللہ تعالیٰ نے جس طرح بھوک اور پیاس کو مٹانے کے لیے اکل وشرب کا انتظام فرمایا ہے اُسی طرح روحانی احساسات کی تسکین کے لیے رضا اور ایقان کے حصُول کا طریقہ بتایا ہے۔ اپنی ذات اور اپنے رب سے راضی انسان ہی اپنے ماضی وحال سے مطمئن اور مسرور رہتا ہے اور اللہ کے عدل وانصاف اور آخرت کی جزاوسزا کا یقین ہی اسے درخشاں مستقبل کا اطمینان دلاتا ہے اور نتیجۃً حقیقی سکوُن عطا کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایمان وایقان سے محروم لوگ کبھی بھی حقیقی شادمانی حاصل نہیں کرسکتے۔ ان کی زندگی تلخ اور تاریک ہوتی ہے۔ وہ مسلسل غم پیہم مصیبت اور ہمیشہ تنگدلی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اپنے آپ سے بیزار اپنے ابنائے نوع سے ناراض اور دنیا کی ہر چیز کے خلاف نفرت کے جذبات پال کر وہ اس عالمِ فراخ کو اپنے لیے سوئی کے ناکے کی طرح تنگ اور محدود کرلیتے ہیں جس میں جینا ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بندۂ مومن بھی کبھی غم وحزن کا شکار ہوجاتا ہے لیکن اول تو اسے غمِ جاں نہیں غمِ جہاں ہوتا ہے، غمِ دنیا نہیں غمِ آخرت ہوتا ہے اور کبھی غمِ جاں اُسے دامنگیر بھی ہو تو اُس کا اثر بالکل عارضی ہوتا ہے، اس لکۂ ابر کی مانند جو وسعتِ افلاک میں نمودار ہوا اور ایمان کی باد تند وتیز اُسے اُڑا لے جائے۔

حقیقتِ رضا کا شعوُر ان اسباب میں سے ایک ہے جو انسان کو ابدی سعادت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

من سعادۃ المرءِ استخارتہ ربہ ورضاہ "اپنے رب سے استخارہ (طلب خیر) کرنے اور اُس کے

---

[1] یہ مضمون بھی شیخ یوسف القرضاوی کی کتاب الایمان والحیاۃ سے ماخوذ ہے۔ [2] المائدہ: ۱۱۹۔

بما قضی، ومن شقاء المرء ترکہ الاستخارۃ وعدم رضاء بعد القضاء۔ (مسند احمد، ترمذی، بخاری)

فیصلہ پر راضی ہو جانے والا انسان بڑا سعادت مند ہے۔ اور بڑا بدبخت ہے وہ شخص جو خدا سے نہ بھلائی طلب کرے اور نہ اس کے فیصلہ پر راضی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مومن ہر کام میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اللہ تعالیٰ سے بھلائی کا طلب گار رہتا ہے۔ وہ دعا کرتا ہے:

اللّٰھم ان کنت تعلم ان ھٰذا الامر خیر لی فی دینی ومعاشی وعاقبۃ امری فیسرہ لی وبارک لی فیہ، وان کنت تعلم ان ھٰذا الامر شر لی فی دینی ومعاشی وعاقبۃ امری فاصرفہ عنی واصرفنی عنہ واقدر لی الخیر حیث کان ثم رضنی بہ۔

اے اللہ اگر تو اس کام کو میرے دین و دنیا کے لیے اور انجام کار کے طور پر میرے لیے بہتر سمجھتا ہے تو اسے مجھ پر آسان کر دے اور اس میں مجھے برکت دے۔ اور اگر تو اس کام کو بلحاظِ دین و دنیا اور بلحاظ انجام میرے لیے برا خیال فرماتا ہے تو اسے میری نظروں سے ہٹا دے اور مجھے اس کام سے باز رکھ۔ اور میرے لیے خیر کو مقدر فرما جہاں بھی ہو، اور اُس خیرِ مقدر کے ساتھ مجھے راضی کر دے۔

چنانچہ مومن اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ـــ خواہ وہ اچھی ہو یا بُری ـــ ہر حال میں راضی رہتا ہے۔ اور صبر و رضا کی یہ صفت اُس کے دل کو کشادہ اور سینے کو فراخ کر دیتی ہے۔ وہ نہ کبھی مغموم ہوتا ہے نہ تنگدل۔ نہ اُسے اپنے آپ پر غصہ آتا ہے نہ اس کائنات پر، نہ زندگی پر اور نہ زندگی سے بہرہ ور مخلوقات پر۔ اس کے برعکس وہ اپنی ذات، اپنے گرد و پیش اور جملہ موجودات سے راضی اور خوش رہتا ہے کیوں کہ مسرّت و رضا کا سرچشمہ اُس کے ہاتھ لگ چکا ہوتا ہے اور وہ ہے اللہ رب العٰلمین پر غیر متزلزل ایمان۔

رضا ایک بہت بڑی روحانی نعمت ہے جس سے اللہ کے منکر یا اُس کی ہستی اور اس کی جزا و سزا میں شک کرنے والے محروم ہیں۔ اس نعمت کو وہی حاصل کر سکتا ہے جس کا اللہ پر ایمان مضبوط ہو۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ پاک کو صبر و استقامت کے ساتھ اپنی حمد و ثنا اور بندگی و عبادت کرتے رہنے کی تلقین کی اور فرمایا لَعَلَّکَ تَرْضٰی (یعنی اِس عملِ ایمانی کے نتیجے میں) ہو سکتا ہے کہ آپؐ نعمتِ رضا کو پالیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربًّا وبالاسلام دینًا وبمحمد رسولًا۔ (رواہ احمد، ومسلم والترمذی)

جو شخص اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہو گیا اُس نے حلاوتِ ایمان کو چکھ لیا۔

قرآنِ پاک میں صحابۂ کرام کی سبقتِ ایمانی اور صداقتِ ایمانی کی شہادت دینے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے اُنہیں رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا عظیم اعزاز عطا فرمایا ہے۔ پس معلوم ہُوا کہ مقامِ رضا پر فائز ہونے کے لیے دولتِ ایمان ناگزیر ہے۔

۱۔ مومن اپنی ذات اور اپنے رب سے راضی ہوتا ہے | اپنی ذات سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وجود اور شخصیت اور کائنات میں اپنے مرتبہ و مقام سے راضی ہے، کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ وہ کوئی مہمل ہستی یا ناقص و حقیر چیز نہیں بلکہ خالقِ کائنات کی صفتِ صنعت گری کا شاہکار ہونے کی وجہ سے ایسی باشرف مخلوق ہے جو زمین پر خدا کی خلافت کے منصبِ جلیل پر فائز ہے۔

علاوہ ازیں مومن اپنے رب سے بھی راضی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کی صفاتِ کمال و جمال پہ ایمانِ کامل اور اس کے عدل اور رحم کا یقینِ محکم رکھتا ہے۔ اور اس کے علم و حکمت کی طرف سے بھی پُوری طرح مطمئن ہوتا ہے نیز وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کا بے پایاں فضل اور اُس کے بے شمار احسانات اُس پر ہیں۔ بقول سیدنا ابراہیم علیٰ نبینا علیہ السّلام:۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۝ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۝ (الشعراء: ۷۸: ۸۲)	میرا رب وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے موت دیگا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا۔ اور جس سے میں اُمید رکھتا ہوں کہ جزا کے دن وہ میری خطا معاف فرما دیگا۔

غرض مومن اپنے حق میں اللہ کی تدبیر کو اپنی تدبیر سے بہت بہتر قرار دیتا ہے۔ وہ اس کے ہر کام کو سراسر رحمت اور سراپا خیر سمجھتا ہے۔ اور اگر اُسے خدا کی خدائی میں کہیں کوئی کجی نظر آئے تو اسے بھی وہ کجی پر محمول نہیں کرتا بلکہ تکمیلِ خیر کا سامان یا اثباتِ خیر کے لیے شرطِ لازم گردانتا ہے۔ مصیبت و تکلیف بلاشبہ شر ہے لیکن اس کے بغیر صبر کا دامنِ خیر بھی تو ہاتھ نہیں آسکتا۔ اسی طرح فقر و افلاس میں اگر ایک صورتِ شر موجود ہے تو انفاق فی سبیل اللہ اور سخاوت و کرم جیسی خیرات و حسنات کے امتیازات بھی اسی کے وجود سے نمایاں ہوتے ہیں لہٰذا اپنی ذات اور اپنے رب کی صفات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ایک بندۂ مومن کو ناراض کرنے والی ہو۔

۲۔ مومن حیات و کائنات سے بھی راضی ہوتا ہے | مومن یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ عالمِ موجودات اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اور اس کا ذرہ ذرہ اللہ کی بے مثال حکمت و دانائی پر دلالت کرتا ہے۔ اُس کے ہمہ گیر رحم و کرم کا

مظہر ہے اور اُس کے لامحدود علم و قدرت کا شاہکار ہے۔ اُسے اِس عظیم کائنات کی تدبیر و انتظام میں کہیں کوئی خرابی اور خلل نظر نہیں آتا۔ وہ انسانوں اور دوسری مخلوقات کو دیکھتا ہے تو اُن کے رزق کی تقسیم، اُن کا غم و انبساط، اُن کی عاجزی و درماندگی اور اُن کی قدرت و توانائی۔ کسی چیز میں بھی اُسے کہیں عدل سے انحراف اور ظلم کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ حق اور سراسر حق ہی مشاہدے میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حیات و موجودات کے اِس پُرحکمت، متوازن اور مبنی بر عدل نظام سے ایک ایماندار کو راضی ہونا ہی چاہیے۔

۳۔ مومن انعاماتِ خداوندی کا گہرا احساس رکھتا ہے اپنے آپ سے بیزار رہنے اور زندگی کا گلہ شکوہ کرنے والے لوگ بالعموم وہ ہوتے ہیں جو موجود انعاماتِ الٰہی کا احساس نہیں رکھتے۔ وہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فلاں شے نہیں۔ ہمیں وہ اور وہ چیز چاہیے لیکن انہیں اظہارِ شکر کرتے کبھی نہیں سُنا گیا کہ یہ اور یہ نعمتیں ہمیں حاصل ہیں۔ اس کے برعکس مومن اللہ کے عظیم احسانات کے احساس سے ہر وقت سرشار رہتا ہے۔ وہ اِس بات کا گہرا شعور رکھتا ہے کہ اللہ نے اسے نسلِ انسانی کے ایک فرد کی حیثیت سے تخلیق کیا، علم و ادراک اور غور و فکر کی صلاحیتیں عطا کیں، نطق و بیان اور سماعت و بصارت سے نوازا، اُسے دست و پا دیئے اور اُن میں فعل و عمل کی قوت و استعداد پیدا کی۔ اس کے پہلو میں دل پیوست کیا اور اُسے اخوت و محبت، رحم و شفقت اور ایثار و قربانی کے جذبات سے معمور کیا۔ اِس کے تن و شکم کی ضروریات کے لیے زمین نے رزق کے خزانے اُگلے اور آسمان سے وحی الٰہی کے ذریعے اس کی فطری امنگوں اور روحانی تقاضوں کو پُورا کیا گیا۔ وہ جب غور کرتا ہے تو اپنی ذات میں بے شمار انعامات موجود پاتا ہے۔ حتیٰ کہ انفس و آفاق اُسے جلی و خفی نعمتوں سے مملو نظر آتے ہیں جن سے وہ براہِ راست یا بالواسطہ استمتاع کر رہا ہوتا ہے" وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا"۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو انعامِ الٰہی کا سب سے زیادہ شعور رکھتے تھے اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے رہتے اور جذباتِ تشکر و سپاس کا اظہار کرتے نہ تھکتے۔ مقصود یہ تعلیم دینا تھا کہ بندوں پر رحمتِ حق کی فراوانی صرف اِس بات کا ہی تقاضا نہیں کرتی کہ وہ اُس کا کبھی شکوہ نہ کریں اور ہمیشہ راضی رہیں بلکہ اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ وہ رب العزت کی تحمید و توصیف میں ہر آن رطب اللسان رہیں۔

۴۔ مومن اللہ کی تقدیر پر راضی ہوتا ہے مومن جو اپنے آپ کو ہر وقت انعاماتِ الٰہی کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کرتا ہے اللہ کی مشیت اور تقدیر ــــ خواہ وہ اچھی ہو یا بُری ــــ پر بھی راضی رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اِس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام عبث، لایعنی اور خلافِ حکمت نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ

خواہ مخواہ اپنے بندوں کو مصیبت میں مبتلا بھی نہیں کرتا۔ ایک مومنِ صادق کی نظر میں رب العزت اپنے بندوں کے لیے والدین سے بھی زیادہ رحیم و شفیق ہوتا ہے۔ اُس کی رحمت، اُس کے قہر و غضب، اُس کے مواخذہ و احتساب بلکہ ہر چیز پر حاوی ہے۔ پھر کسی طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی کے ساتھ ظلم کا ارادہ کرے؟ اُس کا کوئی فیصلہ بظاہر ظلم بھی نظر آئے تو مومن اُسے بھی خیر اور رحمت ہی پر محمول کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا ﴿النساء ۴:۱۹﴾ ”ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ نے اُسی میں تمہارے لیے خیرِ کثیر رکھ دی ہو۔“ اہلِ ایمان کا یہی وہ عقیدۂ رضا بالقضاء ہے جس کے خوشگوار اثرات کو مسلم معاشرہ میں رہنے والے بہت سے اہلِ مغرب نے بھی محسوس کیا ہے۔ انھی میں سے ایک مغربی اہلِ قلم ف۔ س۔ بوڈلے ”میں نے اللہ کی جنت میں زندگی بسر کی“ کے زیرِ عنوان لکھتا ہے۔

”۱۹۱۸ء میں مَیں اپنے ماحول کو چھوڑ کر شمال مغربی افریقہ چلا گیا۔ وہاں مَیں نے بدوؤں کے درمیان صحرا میں سات برس گزارے۔ مَیں اُن کی زبان سیکھتا، انھی جیسا لباس زیبِ تن کرتا، اُن کے ساتھ کھاتا پیتا اور اُن کے سے ہی معمولاتِ زندگی اختیار کرتا تھا۔ اس عرصے میں مَیں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک کتاب تالیف کی جس کا نام الرسول ہے۔ وہ سال جو مَیں نے اُن خانہ بدوش عربوں میں بسر کیے میری زندگی کے بہترین سال تھے اور امن و سکون اور لذتِ حیات سے بھرپور بھی۔ مَیں نے اُن صحرانشینوں میں رہ کر محسوس کیا کہ یہ لوگ انتہائی قلق و اضطراب کے عالم میں بھی پُرسکون رہتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ مقدر ہے ہو کر رہے گا، اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور کسی شخص کو وہی دکھ پہنچتا ہے جو اس کے لیے لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نزولِ بلا کے وقت ایک دوسرے پر تکیہ کر کے بیٹھ رہتے ہیں اور ہاتھ پاؤں باندھ کر مصیبت پہ مصیبت سہتے چلے جاتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ایک واقعہ سُنیے:

ایک دن جھلسا دینے والی تیز ہوا چلی۔ وہ اتنی شدید تھی کہ صحرا کی بے شمار ریت اٹھاتے ہوئے بحر ابیض متوسط عبور کر گئی اور اسے فرانس کی وادی آلرون میں جا پھینکا۔ سخت گرمی کی وجہ سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر کے بال جڑوں سے اکھاڑے جا رہے ہوں۔ غرضیکہ یہ مصیبت میرے لیے اتنی ناقابلِ برداشت تھی کہ مَیں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ لیکن عربوں کی زبان پہ ایک حرفِ شکایت تک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ

انہوں نے جو کچھ کہا وہ تھا "قضاءِ مکتوب" یعنی طے شدہ فیصلہ۔ وہ ایسے مواقع پر زیادہ سرگرمی سے کام کرتے۔ چنانچہ انہوں نے مہلک لُو چلنے سے پہلے ہی اپنی بھیڑ بکریوں کے بچے ذبح کر دیتے۔ پھر ڈھور ڈنگر لے کر جنوب کی طرف پانی کے کنارے چلے گئے۔ اور کوچ کا یہ انتہائی تکلیف دہ کام انہوں نے کمال صبر و سکون اور خاموشی کے ساتھ انجام دیا۔ اُن کے قبیلے کے سردار نے کہا تو یہ کہ "ہمارا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ ہم تو سب کچھ کھو کر بھی صبر کرنے کے عادی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب کے ہمارے مویشی تقریباً چالیس فی صد زندہ بچ رہے ہیں انہی سے ہم نئے سرے سے کام کا آغاز کر سکتے ہیں۔"

۵۔ مومن اللہ کے عطا کردہ رزق پہ راضی ہوتا ہے | مومن اللہ کی تقسیمِ رزق اور اس کے مواہب و عطایا پر ——— خواہ قلیل ہوں یا کثیر ——— راضی رہتا ہے۔ اس لیے کہ اوّلاً وہ اپنے پاس موجود ہر نعمت کو سراسر اللہ کی رحمت اور اس کا فضل تصوّر کرتا ہے۔ ثانیاً اللہ تعالیٰ کو عادل اور حکیم سمجھتا ہے۔ اِن بنیادی حقائق کو ذہن نشین کرنے کے بعد اُسے مال و دولتِ دنیا کے بارے میں اللہ سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ رزقِ حلال کے لیے پوری کوشش کرتا ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو اُس پر قانع ہو جاتا ہے۔ اور اپنے سے زیادہ آسودہ و خوشحال لوگوں کی حالت پہ جلتا نہیں بلکہ اپنے نتائجِ محنت کو صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ یہی مفہوم ہے قناعت کا۔ لیکن بعض لوگوں نے تو لفظِ قناعت پہ ظلم ہی کر دیا۔ اُن کے خیال میں آدمی کمزوری و دوں ہمتی کی زندگی بسر کرے، ترقی و سربلندی کی خواہش کو یکسر پامال کر کے رکھ دے اور بھوک، افلاس اور محرومی ہی کو پسند کرنے لگے تو پھر وہ رضا و قناعت کی صفت سے متصف ہوتا ہے۔ حالانکہ نہ رضا کا یہ مقصود ہے اور نہ قناعت ہی کی یہ صحیح تعبیر ہے۔

اس سلسلہ میں دو باتوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے ——— یہ حقیقت ہے کہ انسان کے دل میں محبتِ دنیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور وہ مال و دولت کی شدید حرص رکھتا ہے۔ حدیثِ نبوی ہے:

لو کان لابن آدم وادیان من ذھب، لا تبغی ثالثًا، ولا یملأ عین ابن آدم الا التراب۔	اگر ابنِ آدم کو سونے سے معمور دو وادیاں بھی مل جائیں تو (اس کی حرص ختم نہیں ہوگی بلکہ) وہ ایسی ہی کسی تیسری وادی کی تلاش میں رہے گا۔ اُس کی آنکھ کو تو (قبر کی) مٹی ہی بھر سکتی ہے۔

انسان کی اِس انتہا پسند فطرت کو معتدل اور متوازن بنانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ تعلیماتِ اسلام نے اس فرض کو

بحسن و خوبی انجام دیا اور ہوس کی آگ کو بہت کچھ ٹھنڈا کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یا ایہا الناس اتقوا اللہ واجملوا فی الطلب، فان نفسا لن تموت حتی تستوفی رزقہا، وان ابطأ عنہا، فاتقوا اللہ واجملوا فی الطلب، خذوا ما حل، دعوا ما حرم (ابن ماجہ)

اے لوگو اللہ سے ڈرو اور مال و دولتِ دنیا کی تحصیل میں حسنِ طلب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کسی شخص کو اس وقت تک موت نہیں آتی جب تک وہ اپنے حصّہ کا رزق پورا پورا حاصل نہ کرلے۔ اگر طے شدہ رزق کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہو تو اپنے اندر خوف خدا پیدا کرو اور حسنِ طلب سے کام لو۔ جو کچھ حلال ملے اُسے لے لو اور حرام سامنے آئے تو اُسے چھوڑ دو۔"

ایک اور مقام پہ فرمایا "لیس الغنیٰ عن کثرۃ العرض انما الغنیٰ غنی النفس (متفق علیہ) غنا مال و اسباب کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ یہ دل کی تونگری کا نام ہے۔ پس قناعت جو مطلوب اور محمود ہے یہ ہے کہ آدمی رزقِ حلال کے لیے سعی کرے اور جو کچھ پاکیزہ و طیب ملے اسے صبر و شکر سے قبول کرے۔ البتہ حرام سے پرہیز کرے چاہے وہ کتنا ہی ارزاں اور فراواں کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ مؤخر الذکر ارشادِ رسولؐ اور بہت سی دیگر نصوصِ قرآن و سنّت ایک اور چیز کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ خوب سے خوب تر اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش کا رُخ دنیا کی ناپائدار چیزوں سے ہٹا کر عقبیٰ کی لازوال نعمتوں کی طرف پھیرنا چاہیے۔ نفس کی بُری اور ناپسندیدہ عادات کو تقویت دینے کے بجائے بندۂ مومن کے لیے ضروری ہے کہ ایثار و قربانی اور بذل و انفاق جیسی ارفع و اعلیٰ صفات کو اپنے اندر پیدا کرے۔ قناعت کا یہ پہلا مفہوم ہے۔

دوسری بات جسے قناعت کے ضمن میں سمجھنے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بعض لوگوں کو تو بغیر کسی کوشش کے مل جاتی ہیں مگر بعض دوسرے حضرات کو نہیں ملتیں اور وہ کوشش بھی کریں تو نہیں مل سکتیں۔ مثلاً خوبصورت اور نوجوان ہونا۔ بلند قامت اور صحتمند ہونا۔ بے غم ہونا یا کثیر الاولاد ہونا۔ اب اگر کوئی بدصورت یہ کوشش کرے کہ وہ حسن و جمال کا پیکر بن جائے تو یہ ناممکن ہے۔ کوئی پیر فرتوت عہدِ شباب کو لوٹانا چاہے تو ظاہر بات ہے اسے ناکامی ہوگی۔ کسی کوتاہ قد کا یہ ارمان کہ وہ بلند قامت ہو جائے کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پے درپے غموں اور صدموں سے نڈھال انسان ہشاش بشاش رہنا چاہے یا کوئی ثمر زندگی سے محروم، عمر کے آخری حصّے میں فرزند ارجمند کا منہ دیکھنا چاہے تو شاید ان حضرات کی آرزوئیں بھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ ایسے لوگوں کو ایمان باللہ بتاتا ہے کہ غنا و سعادت اس چیز کا نام نہیں کہ آدمی اپنی

جملہ خواہشات کی تکمیل میں کامیاب رہے بلکہ غنا و سعادت کا راز خدا کی تقسیم اور تقدیر پر راضی رہنے میں مضمر ہے۔ ارشادِ رسولؐ ہے اِرْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُن اَغنَی النَّاسِ " جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تیری قسمت میں لکھا ہے اس پر راضی ہو جا، تو تمام لوگوں سے زیادہ غنی ہو جائے گا۔ مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى۔ قلیل اور کفایت کرنے والی نعمتیں بہت بہتر ہیں کثیر مگر غافل کر دینے والے انعامات سے۔ دین کی ان تعلیمات کی بدولت محروم لوگ اپنی تلخ اور ناگوار زندگی کو بھی گوارا بنا لیتے ہیں اور پھر اُن کا نفس کبھی ناممکنات اور محالات کی طلب کے درپے نہیں رہتا۔ یہ قناعت کا دوسرا مفہوم ہے ؎

اِنَّ الغَنِیَّ هُوَ الغَنِیُّ بِنَفْسِهٖ ٭ وَلَوْ اَنَّهٗ عَارِی المَنَاكِبِ حَافٍ

مَا كُلُّ مَا فَوقَ البَسِيْطَةِ كَافِيًا ٭ وَاِذَا قَنَعْتَ فَبَعْضُ شَیْءٍ كَافٍ

(ترجمہ) غنی وہی ہے جو دل کا غنی ہو اگرچہ اس کا دوش بے لباس اور پا برہنہ ہوں۔ روئے زمین پر جو کچھ بھی ہے اگر سارے کا سارا تجھے مل جائے تو کافی نہ ہو لیکن اگر تو قانع ہو جائے تو معمولی چیز بھی تجھے کفایت کر سکتی ہے۔

ایک نوجوان کا قصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تیرہ افراد پر مشتمل ایک یمنی وفد آیا۔ آپؐ اس کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور وفد کے ارکان کی خوب عزت و تکریم کی۔ دورانِ قیام انہوں نے مختلف امور کے متعلق استفسار کیا اور علمِ دین حاصل کرتے رہے۔ یہ لوگ آپ کے پاس زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرے۔ اُن کی خواہش تھی کہ جلد از جلد واپس جائیں۔ اور اپنے اہلِ وطن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔ چنانچہ چند دن ٹھہرنے کے بعد وہ رخصت ہوتے وقت آپ کے پاس آئے تو آپؐ نے حضرت بلالؓ کو بھیجا۔ تاکہ انہیں عام وفود سے بہتر ہدایا و تحائف پیش کریں۔ جب وہ تحائف وصول کر چکے تو آپؐ نے فرمایا "تمہارا کوئی ساتھی محروم تو نہیں رہا؟" انہوں نے جواب دیا کہ ایک لڑکا ہے جسے ہم اپنے سامان کے پاس پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا "اُسے بھی ہمارے پاس بھیج دینا" واپس جا کر انہوں نے لڑکے سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور اپنی کوئی حاجت ہے تو پوری کرا لو۔ لڑکا آپ کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا "یا رسول اللہ میں بنی اَبذی کا فرد ہوں اور اُس وفد کے ساتھ یہاں آیا تھا جو ابھی آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ آپؐ نے اُن کی حاجات تو پوری کر دی ہیں ایک میری حاجت بھی پوری کر دیجیے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "تیری حاجت کیا ہے"؟ لڑکا بولا "میری حاجت میرے ساتھیوں جیسی نہیں۔ وہ لوگ آئے تو اسلام کے لیے تھے لیکن دنیا کا مال و متاع لیکر

گئے ہیں۔ میں واللہ صرف اس لیے آیا تھا کہ آپؐ میرے حق میں اللہ سے یہ دعا کریں کہ وہ میری مغفرت فرمائے مجھ پر رحم کرے اور میرے دل کو غنی بنا دے۔ آپؐ نے اُسی وقت لڑکے کی طرف رُخ پھیرا اور دستِ دعا اٹھا دیئے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ وَاجْعَلْ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهٖ۔" پھر اُس لڑکے کو بھی ویسے ہی تحائف عطا کرنے کا حکم دیا جیسے اُس کے ساتھیوں کو دیئے جا چکے تھے۔ اور اس کے بعد یہ حضرات خوشی خوشی یمن روانہ ہو گئے۔

اس واقعہ کو کافی عرصہ بیت گیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر پھر یہی لوگ منیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اپنا تعارف کرایا۔ آنحضرتؐ نے دریافت فرمایا اُس لڑکے کا کیا حال ہے جو تمہارے ساتھ آیا تھا کہنے لگے یا رسول اللہ! اُس جیسا آدمی ہم نے کوئی نہیں دیکھا۔ نہ اُس سے زیادہ قناعت کرنے والا کوئی شخص ہمارے علم میں ہے۔ اگر لوگ ساری دنیا کا مال و دولت بھی آپس میں بانٹ رہے ہوں تو وہ اُن کی طرف بالکل التفات نہیں کرتا۔ اِس پر آپؐ نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اِنِّیْ لَاَرْجُوْ اَنْ يَّمُوْتَ جَمِيْعًا۔ مجھے پوری امید ہے کہ اُس کی موت بھی عالمِ یکسوئی میں واقع ہو گی۔ اُن میں سے ایک صاحب نے پوچھا "اے اللہ کے رسول کیا ہر شخص یکسوئی کی حالت میں نہیں مرتا۔" آپؐ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا "بعض لوگ پراگندگیٔ فکر کے ساتھ مرتے ہیں۔ وہ بسترِ مرگ پر پڑے ہوتے ہیں لیکن اُن کی خواہشات اُن کے افکار، اُن کے پروگرام اور منصوبے انہیں نہ معلوم کہاں کہاں لیے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو عالمِ نزع میں بھی یکسو نہیں ہوتے اللہ کو اُن کی کچھ پرواہ نہیں کہ وہ کس چیز کے غم میں اور کس حالت میں مر رہے ہیں۔" یہ سُن کر انہوں نے کہا "مگر وہ نوجوان تو ہمارے درمیان بہترین زندگی بسر کر رہا ہے۔ دنیا کی محبت اس کے دل میں مطلق نہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق پر پوری طرح قانع ہے۔"

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ارتداد کا جو طوفان اٹھا اُس کی رو میں بہت سے اہلِ یمن بھی بہ گئے۔ اِس موقع پر یہی نوجوان اپنی قوم کو خدا یاد دلاتا رہا اور انہیں اسلام کی حقانیت اور قدر و قیمت بتاتا رہا نتیجۃً اس کی قوم کا کوئی فرد مرتد نہ ہوا۔ — اِس نوجوان کے قصے سے ہمیں کئی سبق ملتے ہیں۔

پہلا سبق تو یہ ہے کہ آدمی کو اُس کے حصے کا رزق مل کے رہتا ہے۔ اہلِ وفد اُسے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ لیکن آپؐ نے استفسار کر کے اسے بُلوایا اور تحائف دیئے۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ دولتِ اسلام کے لیے فکرمند شخص دولتِ دنیا سے محروم نہیں رہتا۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ اللہ سے رحم و مغفرت اور غنائے نفس کا طلبگار بارگاہِ خدا و رسولؐ میں ایک مقامِ خاص کا حقدار بن جاتا ہے جو دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ دیکھیے کئی سالوں کے

بعد جب اہلِ وفد سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو آپؐ نے بطورِ خاص اس لڑکے کے حالات دریافت فرمائے۔ ایک اور سبق جو سب سے اہم ہے یہ ہے کہ قناعت شعار آدمی کو زندگی میں یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ اور موت کے وقت بھی اُس کی توجہ صرف ایک ہی ذات پر مرتکز رہتی ہے۔ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

۴۔ قناعت و رضا سرچشمۂ قوت ہے | بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ غربت و قناعت کی وجہ سے انسان میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ معاشرہ میں اپنا مرتبہ و مقام کھو بیٹھتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ خیال قلتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جتنی خودداری اور عزتِ نفس اور اپنے موقف پر ڈٹ جانے کی طاقت قناعت شعار لوگوں میں پائی جاتی ہے اتنی مزاحمت کسی بڑے سے بڑے دولتمند اور بااثر آدمی میں بھی موجود نہیں ہوتی۔ تاریخ کے صفحات بھی اسی حقیقت پہ شاہد ہیں کہ ظلم و جَور کا مقابلہ کرنے والے، اپنے حقوق کے لیے لڑنے والے اور جابر و جبروت حکمرانوں سے حق و صداقت کی بنیاد پہ ٹکرا جانے والے لوگ بالعموم وہی ہوتے ہیں جنہیں دنیا کمزور اور بے وسیلہ سمجھتی ہے۔ بگر جو تقدیر پہ شاکر اور مصیبت و ابتلا پہ راضی رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک قناعت شعار شخص امیروں کے محلات، بادشاہوں کے خزانوں، اور عیش و عشرت میں پلنے والے لوگوں کے ساز و سامان کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس طرح کہ بلند فضا میں اڑنے والا پرندہ پستی کی طرف دیکھتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ رفیع الشان محلات ریت کے گھروندے ہیں، انسان محض چیونٹیاں ہیں جو زمین پر رینگ رہی ہیں۔

سیدنا مسیح علیہ السلام کا فرمان ہے، اون میرا لباس ہے۔ نانِ جویں میرا طعام ہے اور چاند میرا چراغ ہے۔ میرے پاؤں میری سواری ہیں اور میرا بازو میرا تکیہ ہے۔ میں رات بسر کرتا ہوں تو میرے پاس (اِن چیزوں کے سوا) کچھ نہیں ہوتا۔ اور دن گزارتا ہوں تو اسی حال میں۔ بایں ہمہ روئے زمین پہ مجھ سے زیادہ غنی اور بے نیاز کوئی نہیں۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" کے باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ صبر و قناعت کی زندگی بسر کرنے والا ایک بوڑھا راہ چلتے چلتے کوئی کھجور کی گٹھلی نظر آتی تو اُسے اُٹھا لیتا کہ یہی اس کا رات کا کھانا ہوتا تھا۔ ایک دن اس بوڑھے کو ایک نوجوان ملا جس کے پاس ایک آلہ موسیقی تھا۔ اس پہ ہارون الرشید کی لونڈی گایا کرتی تھی۔ بوڑھے نے اس آلہ کو توڑ دیا۔ ہارون کو خبر پہنچی تو غضبناک ہو گیا اور بوڑھے کو بلا بھیجا جب وہ ہارون کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "بڑے میاں آپ کو یہ کام کرنے پر کس چیز نے مجبور کیا" بوڑھے نے پوچھا کونسا کام؟ اب ہارون یہ تو نہ کہہ سکتا تھا کہ تو نے

مغنیہ کا آلہ موسیقی توڑ دیا ہے۔ وہ بار بار اپنا ہی سوال دہراتا چلا گیا۔ بوڑھا خلیفہ کی کمزوری سمجھ گیا اور کہنے لگا "جناب آپ کے باپ دادا منبر رسول پر خطبہ جمعہ کے دوران یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ (النحل: ۹۰) اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ سو حضور والا میں نے ایک برائی دیکھی اسے مٹا دیا۔ اب آپ کو اعتراض کس چیز پر ہے؟ ہارون کو بھی کہنا پڑا کہ اسے تو مٹا ہی دینا چاہیے تھا۔ واقعہ کا راوی کہتا ہے اس کے بعد بوڑھا اٹھا اور نکل گیا۔ ہارون نے اس کے پیچھے ایک آدمی کو دس ہزار درہم کی ایک تھیلی دیکر بھیجا کہ اگر بوڑھا لوگوں سے اس بات کا ذکر نہ کرے تو اسے تھیلی دے دینا بصورت دیگر واپس لے آنا۔ چنانچہ وہ آدمی بوڑھے کے تعاقب میں نکلا تو اسے دیکھا کہ زمین میں دھنسی ہوئی ایک گٹھلی کو نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے اسے تھیلی کی پیش کش کی اور کہا کہ امیرالمومنین کی طرف سے اسے قبول فرمائیں۔ بوڑھے نے جواب دیا "خلیفہ سے کہو یہ رقم جہاں سے لی ہے وہیں لوٹا دے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" اور دوبارہ گٹھلی کے ساتھ مشغول ہو گیا۔ اور یہ اشعار گنگنانے لگا ؎

اَرَی الدُّنْیَا لِمَنْ ھِیَ فِیْ یَدَیْہِ ھُمُوْمًا کُلَّمَا کَثُرَتْ لَدَیْہِ
تُھِیْنُ الْمُکْرِمِیْنَ لَھَا بِصُغْرٍ وَتُکْرِمُ کُلَّ مَنْ ھَانَتْ عَلَیْہِ
اِذَا اسْتَغْنَیْتَ عَنْ شَیْءٍ فَدَعْہُ وَخُذْ مَا اَنْتَ مُحْتَاجٌ اِلَیْہِ

معلوم ہوا کہ قناعت شعار لوگ ہی دراصل طاقتور ہوتے ہیں۔ حق گوئی اور بے باکی سے کام لیتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام دے سکتے۔ ان کی عزت نفس اور خودداری انہیں امراء و ملوک سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس وجہ سے عامۃ الناس بھی انہیں سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ جو رضا و قناعت کے پیکر ہوتے ہیں کبھی کفر و باطل پہ سکوت اختیار نہیں کرتے۔ ان میں اتنی جرأت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے جابر سلاطین کے سامنے بھی کلمۂ حق کہہ سکیں۔

ؔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جس کے ہاتھ میں بہت زیادہ مال و دولتِ دنیا ہو اسے بکثرت غم و افکار لاحق رہتے ہیں۔ اور جو لوگ دنیا کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں دنیا انہیں ذلیل کرتی ہے۔ اور جو اسے ہیچ سمجھتے ہیں یہ انہیں معزز ٹھہراتی ہے۔ جب تجھے ایک چیز کی ضرورت نہیں تو اسے حاصل کرنے کی فکر چھوڑ۔ ہاں جس چیز کی تجھے حاجت ہے اسے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔